رضوان اللہ

# الامّی

عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناخواندہ تھے اور لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے اور اس کے اِثبات میں قرآن و حدیث سے چند ایک دلائل بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کی یہ آیت:

۱۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ. (العنکبوت ۲۹:۴۸)

”تم اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے، البتہ شک میں پڑ سکتے تھے۔“

مگر ذرا سے تامل سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت کا زیر بحث امر سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ یہاں ماضی استمراری کے صیغہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معمول کی نفی کی گئی ہے کہ آپ کوئی کتاب پڑھا کرتے یا اس کو لکھ لیا کرتے تھے اور محض اس بات سے، ظاہر ہے کہ کسی شخص کے ناخواندہ ہونے پر ہرگز کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اس طرح کی مصروفیت زندگی میں کبھی بھی اختیار نہیں کرتے، مگر اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی حد تک لکھ پڑھ لینے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔

آیت میں خواندہ ہونے کی نفی کرنے کے بجاے صرف یہ بتایا گیا ہے کہ آپ کوئی کتاب نہیں پڑھتے رہے اور نہ اس کو لکھتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہاں ”کوئی کتاب“ سے درحقیقت مراد کیا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ ’کِتٰب‘ پر ایک تنوین اور اس سے پہلے حرف ’مِنْ‘ آیا ہے، اس لیے یہاں

ہر قسم کی کتاب مراد ہے، مگر زبان کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو 'کِتٰب' کی تنکیر اور اس میں آجانے والی تعمیم سے یہ کسی طور لازم نہیں آتا کہ صرف یہی معنی مراد لیا جائے کہ بعض اوقات اس طرح کے معنی میں بھی ہم جانتے ہیں کہ سیاق وسباق سے ایک طرح کی تخصیص پیدا ہو سکتی ہے۔ اردو میں اگر دیکھنا چاہیں تو یہ ایسا ہی معاملہ ہے، جیسے کسی تعلیمی ادارے میں بیٹھے ہوئے ایک ہی مضمون کے دو اساتذہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے کہیں کہ 'آج کوئی بھی طالب علم نہیں آیا' تو اس 'کوئی بھی' کی تعمیم کے باوجود ہمیں معلوم ہے کہ اس سے صرف اور صرف اُس خاص مضمون کو پڑھنے والے طلبہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ آیت کے سیاق وسباق میں بھی دو گروہوں کا معاملہ زیر بحث ہے: ایک وہ لوگ ہیں جو پہلے سے اپنے پاس خدا کی ایک کتاب رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو نئی کتاب، یعنی قرآن پر ایمان لے آئے اور اب اُس کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ اول گروہ میں سے جنھوں نے اس دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، وہ قرآن کو خدا کا کلام سمجھنے کے بجاے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تصنیف قرار دے رہے ہیں اور اس کے پیچھے ان کا ایک شک کارفرما ہے کہ جس کی بنیاد دراصل اس آیت میں ڈھائی گئی ہے۔ وہ شک یہ نہیں ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں، اس لیے آپ نے قرآن جیسی کتاب لکھ ڈالی ہے کہ کسی شخص کے پڑھے لکھے ہونے اور قرآن تصنیف کر دینے میں کوئی ادنیٰ درجے کی بھی مناسبت نہیں ہے، بلکہ ان کا شک اصل میں یہ ہے کہ یہ پچھلی الہامی کتابوں سے مستعار لی گئی تعلیم ہے، جو قرآن کے نام سے پیش کی جا رہی ہے، اور اس آیت میں درحقیقت ان کے اسی شک کو دور کرنا پیش نظر ہے۔ سو یہ سیاق ہے کہ جس نے تنوین اور حرف 'مِنْ' کے باوجود لفظ 'کِتٰب' میں ایک طرح کی تخصیص پیدا کر دی ہے اور اس کا مطلب اب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم 'کوئی بھی کتاب'، یعنی اس طرح کی کوئی بھی الہامی کتاب کبھی نہیں پڑھتے رہے۔

تعمیم کے بعد اس طرح کی تخصیص قرآن کے دیگر مقامات پر بھی بہ آسانی دیکھ لی جا سکتی ہے، مثلاً ذیل کی آیت میں 'عِلْم' کا لفظ تنوین اور حرف 'مِنْ' کے ساتھ آیا ہے اور اس سے مراد کسی بھی قسم کا نہیں، بلکہ ایک خاص نوعیت کا علم ہی ہے:

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا. (الانعام ۶: ۱۴۸)

''ان سے پوچھو، تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ ہمارے سامنے اسے پیش کر سکو؟''

'مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ' کا بیان کردہ ہمارا یہ مفہوم اگر مان لیا جائے تو اب 'وَلَا تَخُطُّهٗ

بِیَمِیۡنِكَ‘ کا درست محل بھی سمجھ میں آجاتا اور یہاں اسے بیان کرنے کا مقصد بھی ہر لحاظ سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کو دوسری کتابوں کا چربہ اور اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ آپ کبھی اس طرح کی کوئی کتاب پڑھتے رہے اور نہ اسے لکھ کر اپنے پاس محفوظ کرتے رہے کہ یہ شک کیا جائے کہ اس کی مدد سے نعوذ باللہ! آپ نے قرآن تصنیف کر لیا ہو۔

۲۔ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ. (الاعراف ۷: ۱۵۸)

”سو اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔“

یہ دوسری آیت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخواندہ ہونے کے حق میں پیش کی جاتی ہے، مگر ہم تفصیل سے بتاتے ہیں کہ اس سے بھی یہ مفہوم مراد لینا کسی صورت ممکن نہیں۔

’امی‘ کا لفظ اصل میں ’اُمّ‘ سے ہے اور اس میں ’ی‘ نسبت کے لیے آئی ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ جب لغوی مفہوم میں استعمال ہو تو اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ اس خالص لغوی مفہوم میں یہ قرآن میں بھی ایک جگہ استعمال ہوا ہے، مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ ان بے پڑھوں سے مراد اصل میں خدا کی کتاب نہ پڑھے ہوئے لوگ ہیں:

وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ. (البقرہ ۲: ۷۸)

”اور ان میں بن پڑھے عامی بھی ہیں جو اللہ کی کتاب کو صرف اپنی آرزوؤں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں۔“

اپنے لغوی مفہوم سے آگے بڑھ کر قرآن میں یہ لفظ مشرکین عرب کے لیے بطور اسم بھی آیا ہے اور ان کے اوپر اس کے اطلاق کی وجہ ان لوگوں کا ہدایت کے علم سے محروم ہونا اور اہل کتاب کے مقابلے میں بے کتاب ہونا ہے۔[1] دقت نظر سے دیکھا جائے تو یہ دونوں پہلو ذیل کی دو آیات میں ایک ترتیب سے پڑھ لیے جا سکتے ہیں:

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیۡهِمۡ

”اسی نے امیوں کے اندر ایک رسول انھی میں سے اٹھایا ہے جو اس کی آیتیں انھیں سناتا اور ان کا

---

۱۔ لفظ کا یہی اطلاق ہے کہ اسے صرف مشرکین عرب کے لیے نہیں، بلکہ فارس کے مجوسیوں کے لیے بھی بولا گیا ہے (الطبری)۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. (الجمعہ ۶۲: ۲)

تزکیہ کرتا ہے اور اس کے لیے انھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گم راہی میں تھے۔''

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ. (آل عمران ۳: ۲۰)

''اور اہل کتاب سے اور ان امیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتے ہو؟''

چونکہ مشرکین عرب کے اس گروہ کا ایک حصہ بنی اسمٰعیل بھی ہیں، اس لیے ان پر بھی اس لفظ کا اطلاق آپ سے آپ ہو جاتا ہے، اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس لفظ کا استعمال اصل میں بنی اسمٰعیل کے ایک فرد ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ پیش کردہ آیت میں بھی ہم سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے لیے 'امی' کا لفظ اسی پہلو کی رعایت سے ارشاد فرمایا ہے۔

آیت کا سیاق و سباق بھی اسی بات کی تائید کرتا نظر آتا ہے، اس لیے کہ یہاں آپ کی دعوت آپ ہی کی زبان سے لوگوں اور خاص طور پر بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس موقع پر انھیں یہ بتانے کی کوئی حکمت نہیں ہو سکتی کہ آپ خواندہ ہیں یا ناخواندہ، بلکہ اس مقام کا تقاضا ہے کہ ان کے مغالطے کو دور کرتے ہوئے بتایا جائے کہ آپ صرف بنی اسمٰعیل کے لیے نہیں، بلکہ بنی اسرائیل کے لیے بھی مبعوث ہوئے ہیں اور مزید یہ کہ آپ کے امی، یعنی اسمٰعیلی ہونے کے حوالے سے انھیں اپنی کتاب میں موجود عہد کی بھی یاد دہانی کرا دی جائے کہ جس میں خاص طور پر ''ان ہی کے بھائیوں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں:

''میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔'' (کتاب استثنا ۱۸: ۱۸)

خلاصہ یہ کہ اس آیت کا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس میں صرف آپ کے بنی اسمٰعیل میں سے ہونے کو نمایاں کیا گیا ہے، وگرنہ جہاں تک کتابی اور درسی علم سے دوری کی بات ہے تو یاد رہنا چاہیے کہ اس میں مشرکین اور بنی اسمٰعیل کا کوئی اختصاص نہ تھا، بلکہ اُس علاقے اور زمانے کے عام رواج کے مطابق وہاں رہنے والے یہود کا معاملہ بھی کم و بیش اسی طرح کا تھا۔

۳۔ اس بحث میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب غار حرا میں حضرت جبریل وحی لے کر آئے

تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: 'اقرأ' اور اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: 'ما أنا بقارئ'۔ اس جملے کا ترجمہ یہ کرتے ہوئے کہ 'میں پڑھ نہیں سکتا'، آپ کے ناخواندہ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

عربی زبان میں 'قرأ' کا مطلب پڑھنا ہے۔ بعض اوقات اس سے مراد کسی لکھی ہوئی شے کو دیکھ کر پڑھنا ہوتا ہے، جیسے اس آیت میں بھی کتاب کو دیکھ کر پڑھنا مراد ہے:

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۱)

''انھیں یاد رکھنا چاہیے جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے رہنماؤں سمیت بلائیں گے۔ پھر جن لوگوں کو ان کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، وہی اپنا اعمال نامہ (خوشی سے) پڑھیں گے۔''

کبھی یہ فعل بغیر کسی کتاب کو دیکھے صرف زبانی پڑھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ تہجد کی نماز کے دوران میں قرآن پڑھنے کے لیے، ہم دیکھتے ہیں کہ یہی فعل لایا گیا ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ. (المزمل ۷۳: ۲۰)

''چنانچہ اب قرآن میں سے جتنا ممکن ہو، (اس نماز میں) پڑھ لیا کرو۔''

عربی زبان میں جب فعل کے ساتھ کوئی صلہ آتا ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس کے معنی و مفہوم پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ 'قرأ' کے ساتھ بھی جب حرف 'علی' آئے تو اب اس کا معنی صرف پڑھنا نہیں رہتا، بلکہ پڑھ کر سنانا، یعنی کسی بات کو دوسروں تک پہنچانا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس آیت میں یہ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے:

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ. فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۹۸-۱۹۹)

''اور اگر ہم اس کو کسی عجمی پر نازل کر دیتے پھر وہ انھیں پڑھ کر اسے سناتا تو یہ پھر بھی اس پر ایمان نہ لاتے۔''

اب مذکورہ روایت پر غور کریں تو اس میں 'قرأ' فعل کے بعد کسی کتاب کا کوئی ذکر ہوا ہے اور نہ اس طرف اشارہ کرنے والا کوئی قرینہ ہی اس میں پایا جاتا ہے، چنانچہ یہاں دیکھ کر پڑھنا تو کسی صورت مراد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح روایت کی رو سے چونکہ یہ پہلی وحی کے نازل ہونے کا واقعہ ہے کہ جس میں پہلے سے کچھ حفظ ہونے کا بھی کوئی اِمکان نہیں، اس لیے یہاں زبانی پڑھنا بھی کسی طرح مراد نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں 'اقرأ' درحقیقت

پڑھ کر سنانے اور اس دعوت کو دوسروں تک پہنچانے کے معنی میں ہے کہ روایت میں مذکور ساری بات، یعنی اس ذمہ داری کے بعد آپ کے جسم پر اس کے اثر سے کپکپی طاری ہو جانا اور آپ کا فرمانا کہ مجھے اپنی جان کا خوف محسوس ہوتا ہے اور اس کے جواب میں حضرت خدیجہ کا یہ کہہ کر تسلی دینا کہ آپ ان لوگوں میں بہت اچھے اخلاق کے مالک رہے ہیں، یہ سب یہی بتا رہا ہے کہ یہاں 'اقرأ' دراصل اپنی قوم کو دعوت دینے کے معنی میں ہے۔

یہاں کسی کو یہ اشکال پیش نہیں آنا چاہیے کہ اس روایت میں تو 'قرأ' فعل کے ساتھ 'علی' کا صلہ موجود نہیں ہے، اس لیے کہ یہ صلہ در حقیقت حذف ہو گیا ہے اور قرائن کے ہوتے ہوئے ایسا ہو جانا ہر اعتبار سے روا ہے، اور اس کی مثال میں ذیل کی آیت بھی دیکھ لی جا سکتی ہے، جس میں یہ صلہ محذوف ہے اور اس کے باوجود ہر طالب علم پر واضح ہے کہ اس جگہ یہ فعل اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (الاعراف ۷: ۲۰۴)

''جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

غرض یہ ہے کہ زیر بحث روایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب دعوت کا بیان ہے اور اس میں بھی آپ کی ناخواندگی کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۴۔ اس ذیل میں ایک اور روایت سے بھی مدد لی جاتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو امی قرار دیا ہے اور وہاں ہر لحاظ سے واضح ہے کہ اس لفظ سے مراد اس کا لغوی مفہوم ہی ہے:

إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب. (بخاری، رقم ۱۸۱۴)

''ہم ایک بے پڑھی قوم ہیں۔ نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں یہ اپنے خالص لغوی مفہوم میں آیا ہے، مگر واضح رہنا چاہیے کہ زبان میں بعض اوقات کوئی لفظ کسی جماعت کے لیے بولا جاتا ہے اور اس سے مقصود اُس کے سب افراد قطعاً نہیں ہوتے، بلکہ اُس جماعت کا مجموعی حیثیت میں ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیت میں مشرکین عرب کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ لوگ کھلی گم راہی میں مبتلا تھے۔ اب ہر طالب علم سمجھ سکتا ہے کہ یہ اس قوم کے بارے میں ایک مجموعی نوعیت کا تبصرہ ہے، اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں موحدین اور دین حنیف کے حامل لوگ بھی معتد بہ تعداد میں موجود تھے:

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. (الجمعہ ۶۲: ۲)

''حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گم راہی میں تھے۔''

مذکورہ روایت میں بھی اہل عرب کی مجموعی حالت کا بیان کیا گیا ہے،[۲] ورنہ ہمیں علم ہے کہ ان میں سے متعدد افراد لکھ پڑھ سکتے تھے اور ان لوگوں کی یہی صلاحیت[۳] باعث ہوئی کہ قرآن کو اس زمانے میں لکھا گیا اور ادھار لین دین کے معاملات کو بھی خدا کی طرف سے لکھنے کی تلقین فرمائی گئی:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ. (القلم ۶۸:۱) ''یہ سورۂ نون ہے۔ قلم گواہی دیتا ہے اور جو کچھ (لکھنے والے اس سے) لکھ رہے ہیں۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ. (البقرہ ۲: ۲۸۲) ''ایمان والو، تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو۔''

مدعا یہ ہے کہ دیگر دلائل کی طرح یہ روایت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخواندہ ہونے کو ثابت نہیں کرتی، اس لیے کہ یہ آپ کی قوم پر ایک مجموعی تبصرہ ہے اور اسے کسی متعین شخص کے ناخواندہ ہونے پر ہرگز دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

ان سلبی دلائل کی درست حیثیت بیان کرنے کے بعد اب ہم اس معاملے میں اثباتاً کچھ چیزوں کو دیکھتے ہیں:

۱۔ عرب میں باقاعدہ طور پر مدرسی تعلیم کے ادارے موجود نہ تھے، البتہ ان میں سے بعض لوگ ہمیں انفرادی طور پر اس کی تحصیل کرتے ضرور نظر آتے ہیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تاریخ کے ماخذ میں کوئی ادنیٰ درجے کی بھی شہادت موجود نہیں ہے کہ آپ نے کسی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ہو اور باقاعدہ طور پر لکھنا پڑھنا سیکھا ہو۔[۴] تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض لوگ بنا کسی استاد کی مدد کے واجبی سا لکھنا پڑھنا بہر حال جان جاتے ہیں اور اس کی وجہ عام طور پر طبعی ذوق یا پھر اس سے جڑی ہوئی ان کی کوئی نہ کوئی ضرورت

---

۲۔ اور یہ ایسا ہی ہے، جیسے ہم اردو میں کسی افریقی ملک کے لیے ان پڑھ اور کسی یورپی ملک کے لیے کہیں کہ وہ پڑھی لکھی قوم ہے۔

۳۔ ان کی اس صلاحیت پر یہ امور بھی شاہد ہیں کہ شعب ابی طالب اور صلح حدیبیہ کے معاہدات بھی باقاعدہ لکھے گئے اور اسی طرح غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ساتھ تعلیم بطور فدیہ کا معاملہ بھی کیا گیا۔

۴۔ مدرسی تعلیم حاصل نہ کرنے کا یہی وہ پہلو ہے کہ بعض حضرات نے 'الامی' کا ترجمہ ''بے پڑھا'' کیا ہے: کنزالایمان، احمد رضا خان صاحب بریلوی۔

ہوتی ہے۔ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اور مزاج کو دیکھا جائے اور آپ کے معمولات اور خاص طور پر تجارت کی مصروفیات اور اس غرض سے کیے جانے والے اسفار بھی اپنے سامنے رکھے جائیں تو قیاس تقاضا کرتا ہے کہ آپ کے ہاں لکھنے پڑھنے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت لازماً موجود رہی ہو گی۔

۲۔ اوپر ایک آیت 'وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ' پر تفصیل سے بحث گزری۔ اس کا مطلب اگر یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مذہبی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے تو اس میں آپ کے پڑھ لکھ لینے کی صلاحیت پر ایک اشارہ بہر صورت پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایسا ہی جملہ ہے، جیسے ہم اردو زبان میں کسی طالب علم کے بارے میں کہیں کہ اس لڑکے کو اسلامیات کی کتاب کبھی پڑھتے نہیں دیکھا گیا تو اس جملے میں چونکہ ایک خاص نوعیت کی کتاب پڑھنے کی نفی کی گئی ہے، اس لیے اس کا یہ مطلب اِحتمالاً ہی سہی، بہر حال لیا جا سکتا ہے کہ وہ پڑھ تو سکتا ہے، مگر اسلامیات کی کتاب نہیں پڑھتا۔

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تو قیاس اور احتمال کے درجے کے دلائل تھے، اب ہم بالکل صریح لفظوں میں بتاتے ہیں کہ آپ حقیقتاً لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا اور اس کی تحریر میں یہ الفاظ آئے کہ ''یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے کیا'' تو اس پر قریش کی طرف سے اعتراض ہوا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر آپ کے آڑے کیوں آتے؟ آپ صرف محمد بن عبد اللہ ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ میں محمد بن عبد اللہ بھی ہوں اور محمد رسول اللہ بھی۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس تحریر سے 'رسول اللہ' کا لفظ مٹا دو۔ حضرت علی نے کہا کہ خدا کی قسم! میں اسے کبھی نہیں مٹاؤں گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تحریر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ راوی بیان کرتے ہیں: 'وليس يحسن يكتب'، کہ آپ اچھی طرح نہیں لکھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے، محض یہ الفاظ بھی آپ میں پائی جانے والی واجبی صلاحیت کا پتا دیتے ہیں، مگر اس کے بعد تو روایت میں حد درجہ صراحت ہو گئی ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا کہ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے قریش کے ساتھ کیا'' (بخاری، رقم ۴۲۵۱)۔

صحیح بخاری کی اس روایت سے یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھ پڑھ سکتے تھے، اب آخر میں ایک ضروری بات بھی سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ آپ کی طرف سے قرآن جیسا کلام پیش کرنے میں جو ایک معجزاتی پہلو پایا جاتا ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ آپ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور اس کے باوجود آپ نے یہ کلام

پیش کیا، بلکہ اصل معجزہ یہ ہے کہ آپ نے کسی استاد سے پڑھا اور نہ خود سے کسی مذہبی کتاب کا کبھی مطالعہ کیا اور اس کے باوجود، اس قدر وقیع اور اعلیٰ کلام پیش کر دیا جو ظاہر ہے کہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ آپ کا اپنا تصنیف کردہ نہیں، بلکہ لازمی طور پر اللہ ہی کا کلام ہے۔

---

## صدق

''... صدق... قول و فعل اور ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، اُس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو یہ زبان اور عمل کی سچائی ہے، لیکن اِس کے ساتھ نیت اور ارادے کی سچائی بھی لازماً شامل ہونی چاہیے۔ قرآن نے اِس کے ضد کردار کو نفاق اور اِسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے، پھر جگہ جگہ وضاحت فرمائی ہے کہ خدا کے نزدیک عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو کارگاہ قلب میں تیار کیا جائے، لہٰذا صدق کا درجۂ کمال قول و فعل اور ارادے کی اِسی مطابقت سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں 'صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ' (اللہ سے جس چیز پر عہد کیا تھا، اُسے پورا کر دکھایا) کے الفاظ اِسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی زبان کا حرف، دل کا ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا مظہر بن جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ.

(الحجرات ۴۹: ۱۵)

''(یاد رکھو)، مومن تو در حقیقت وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی سچے لوگ ہیں۔'' (جاوید احمد غامدی، میزان ۲۵۰)